**Negotiations 1:3 (2022) pp. 1-12** **ISSN: 2789-293X**

# بلوچستان میں اُردو ناول اور مزاحمت

## *Urdu Novel in Balochistan and Resistance*

*Muhammad Kamran Shahzad*
Lecturer, Punjab College Sargodha, Pakistan

**KEYWORDS**

Pakistan Urdu Novel
Balochistan
Resistance
Identity

**DATES**

Received 06-8-2022
Accepted 28-8-2022
Published 20-9-2022

**QR CODE**

**ABSTRACT**

*The tradition of Urdu novel in Pakistan is very wonderful, but besides other provinces, very few people in Balochistan have written Urdu novels. Among them are Shaheen Bukhari, Dr. Firdous Anwar Qazi Agha Gul and Faris Mughal are very famous. In their novels, novelists have reflected prevailing situation Balochi culture, political issues of Balochistan and diminishing identity of Baloch tribes. This article presents the elements of resistance in Agha Gul's "Dasht-e-Wafa" and "Bela" Faris Mughal's "Soo Sal Wafa".*

DOI: https://doi.org/10.54064/negotiations.v2i3.59

پاکستان میں اردو ناول کی روایت بہت شاندار ہے مگر دوسرے صوبوں کے برعکس بلوچستان میں چند گنے چنے لوگوں نے اردو ناول تحریر کیا ہے۔ ان میں شاہین بخاری، ڈاکٹر فردوس انور قاضی، آغا گل اور فارس مغل کے نام نمایاں ہیں۔ ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں بلوچستانی سماج کے علاوہ وہاں کے عصری حالات، سیاسی مسائل اور بلوچ قبائل کی معدوم ہوتی شناخت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس مقالے میں آغا گل کے "دشت وفا" اور "بیلہ" جبکہ فارس مغل کے "سو سال وفا" میں مزاحمتی رنگ کو پیش کیا گیا ہے

بلوچستان رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا اور آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا صوبہ ہے۔ معدنی وسائل سے مالا مال علاقہ ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی سرحد ایران اور افغانستان سے ملتی ہے۔ اس لیے تہران میں واقع علاقہ ایرانی بلوچستانی کہلاتا ہے۔ بلوچستان معدنی ذخائر کرومائٹ، سیسہ، مینگانز، نکل، زنک، جنگلات، قدرتی گیس جیسے وسائل سے ثروت مند ہے۔

بلوچستان کی زیادہ تر آبادی قبائل پر مشتمل ہے، جن کی زبان بلوچی ہے اور بلوچ کہلاتے ہیں۔ ان بلوچوں کا قیامِ پاکستان کے وقت ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار تھا لیکن پچھلی چند دہایوں سے عالمی سازشوں، غیر ملکی اور مقتدر طبقے، حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشیوں، ذاتی مادیت پرستی، سیاسی اور معاشی فائدوں سے وہاں کے حالات کو دگرگوں کیا گیا تو وہاں لسانی، مذہبی ثقافتی نفرتوں کو پروان چڑھایا گیا۔ مقامی سرداروں کو آپس میں لڑایا گیا۔ ہمارے نام نہاد سیاست دانوں اور بیوروکریسی نے بلوچوں کو انکے حقوق اور وسائل سے بھی محروم کر دیا ہے اور ان کے جائز مطالبات کو غداری قرار دیا جاتا۔ علاوہ ازیں ان کے سرداروں کے قتل اور عام لوگوں کے اغوا اور تشدد کے سلسلے نے بلوچ عوام میں نفرت کی آگ کو تحریک دی جس کا پورا فائدہ ملک دشمنوں نے اٹھایا۔ بلوچستان میں مداخلت کر کے ان کی محرومیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ملک کو خانہ جنگی کی کیفیت کی طرف لے جانے میں ہر ممکن کوشش کی۔ ان محرومیوں کے باعث بلوچ قوم نے صوبائی خود مختاری کا نعرہ لگایا، جس کے سبب ہماری فوج اور وہاں کے سرداروں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔ میر خدا بخش بجارانی بلوچستان کی عوامی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ پورا علاقہ معدنی دولت اور ذراعتی امکانات سے مالا مال ہے۔ پاکستان میں صوبہ بلوچستان میں بلوچوں کی زبردست اکثریت ہے۔۔۔۔ پاکستان کی سالمیت، حفاظت اور ترقی میں بلوچوں کا زبردست حصہ ہے۔ یہ خیال کرنا کہ بلوچ پاکستان کی سرحد سے باہر کسی غیر ملک یا قوم سے کسی قسم کی مدد لینا، ان سے امیدیں لگانا یا ان سے کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلوچوں کی تاریخی روایات اور انکی قومی نفسیات سے مکمل ناواقفیت کا ثبوت ہے"[1]

بلوچستان میں اگر اُردو فکشن کی روایت کا جائزہ لیں تو دو چار ناول نگاروں کے علاوہ بلوچستان کے مسائل پر قلم اٹھانے والے خاموش نظر آتے ہیں۔ بلوچستان میں ناول کا آغاز بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے ہوا۔ اس میں اولین نام شاہین بخاری کا ہے جس کا پہلا

---

[1] جسٹس خدا بخش میر بجارانی، **بلوچستان تاریخ کے آئینے میں** (کوئٹہ: نساٹر یڈرز، 1984ء)، 22۔

ناول "ادھورے گیت" 1968ء میں شایع ہوا۔ اس کے علاوہ اونچی حویلی 1973، خون آرزو 1974، اور آنسو کی زبان 1975ء، میں شایع ہوا ان ناولوں میں اپنے مشاہدات اور محسوسات کو بیان کیا۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا ناول بعنوان "خوابوں کی بستی" 1990ء میں شایع ہوا جس میں پاکستانی سیاست کو موضوع بنایا گیا۔ 21ویں صدی میں بلوچستان کے فکشن نگاروں میں نمایاں نام آغا گل اور فارس مغل کا ہے آغا گل نے افسانہ اور ناول دونوں میں خامہ فرسائی کی اور بلوچستان کی پچاس سالہ تاریخ کو ذاتی مشاہدے سے آئینے کی طرح صاف اور شفاف دکھایا جبکہ فارس مغل کے دو ناول منظر عام پر آچکے ہیں ان کا پہلا ناول "ہم جان" ہے، جو موضوع کے اعتبار سے انفرادیت رکھتا ہے۔ ناول میں معذور افراد کی انسانی معاشرے کے نزدیک کیا حیثیت ہے اور ان کے مایوسی سے زندگی کی تگ و دو کے سفر کی داستان دبیان کی گئی ہے۔ "سو سال وفا" میں بھی محبت کی کہانی کے ساتھ ساتھ نائن الیون اور اکبر بگٹی کے قتل کے بعد بلوچستان کی سیاست پر قلم اٹھایا۔ راقم اپنے مقالہ میں آغا گل کے "دشت وفا" اور "بیلہ" جبکہ فارس مغل کے "سو سال وفا" میں مزاحمتی رنگ کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرے گا۔

آغا گل نے بلوچستان کی تاریخ، معاشرت، معاشی اقدار اور سیاست کو ژوف نگائی سے اپنے ناولوں میں بیان کیا۔ اس ضمن میں ان کا ناول دشت وفا (1992ء) میں شایع ہوا، جس میں مصنف نے بلوچستان کے تاریخی سماجی واقعات کے ساتھ مقامی لوگوں کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ آغاز میں انیس سو ستر کی دہائی میں بلوچستان کی سیاسی نظام کو موضوع بنایا، جب سرداروں اور نوابوں نے اپنی ذاتی مفادات کے حصول کے لیے بلوچستان کے نوجوانوں کو لسانی، ثقافتی اور قومیت کا درس دے کر مزاحمت پر اکساتے تھے۔ علاوہ ازیں بلوچستان میں ہونے والی حالیہ دہشتگردی اور نائن الیون کے بعد سیاسی منظر نامے کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ نوجوان جو کسی معاشرے کے لیے ریڑھ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ان سرداروں کی مفاد پرستی کے باعث حالات دگرگوں ہوئے دو نوجوان کتابوں کے بجائے بندوق اٹھانے پر مجبور ہوگئے اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے دہشتگردی جیسے ناسور جنگ میں کود پڑے۔ اس ضمن میں ناول کا مرکزی کردار "نجیب" اہم حیثیت رکھتا ہے، جس کے ساتھی پہاڑوں میں آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے جن کی مدد کے لیے بغاوت کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کے علاوہ مصنف نے کوئٹہ شہر کی عصری اور سماجی صورتحال سے پردہ اٹھاتے ہوئے بلوچ عوام کی محرومیوں کو بے باک انداز میں بیان کیا۔ ناول کے حوالے سے آغا گل اپنے ایک مضمون میں رقم کرتے ہیں:

> "جب بلوچستان کی آئینی منتخب حکومت کو توڑ کر لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔ ان پر سیاسی بلکہ مجرمانہ کیس بنوائے گئے نوجوان بندوقیں اٹھا کر پہاڑوں پر جانکلے۔ کالج یونیورسٹی سے ویرانوں کی راہ لی۔۔۔۔ غرضیکہ بلوچستان کی کئی نسلیں تباہ ہوگئیں"[2]

مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو آغا گل اپنے تمام ناولوں میں بلوچستان کی سیاسی لسانی سماجی اور مقامی عوام کی محرومیوں کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ آغا گل کے ہاں مزاحمت کا تخریبی رنگ نمایاں ہے۔ پاکستان میں بسنے والوں کا ستر سال سے یہی المیہ ہے کہ

---

[2] آغا گل، **دشت وفا کے بارے میں آغا گل نمبر، مشمولہ روشناس، شمارہ 6** (کراچی، 2011ء)، 11۔

یہاں جو بھی حکمران آیا اس نے عوام کو سہانے سپنے تو دکھائے لیکن اقتدار میں آتے ہی بنیادی سہولتیں بھی فراہم نہیں کر سکے۔ اوپر سے یہ ظلم ہوا کہ یہاں بالخصوص بلوچستان کے باشندوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر اپنے ہی وسائل اپنے ہی ہاتھوں سے برباد کر دیے۔ آغا گل نے اس المیہ کو ان الفاظ میں رقم کیا:

> "سڑکیں آپ نے فائرنگ سے بند کر دی ہیں۔ ریل کی پٹڑیاں آپ اکھیڑ رہے ہیں۔ کوہلو ماوند میں بجلی لانے کی اجازت نہیں ہے۔ کوہلو سبی روڈ بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ روزگار کیا بندوقوں کی نالیوں سے نکلے گا۔ یا آسمان سے ٹپکے گا۔ من وسلویٰ کی طرح۔ یہ تو خیر ایک علاقے کی مثال دی۔ کوئٹہ کراچی روڈ آپ بننے نہیں دیتے۔ امریکہ نے کوئٹہ خضدار کراچی ریل کی پٹڑی بچھانے کا عندیہ دیا تھا۔ سرداروں نے مزاحمت کر کے منصوبہ ہی ختم کرا دیا۔ ہم آپ کا کیا ساتھ دیں"[3]

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ 1970ء کی دہائی کے بعد سرداروں اور نوجوانوں نے ذاتی مفادات کے لیے بلوچستان کے نوجوانوں کو مزاحمت پر اکسایا۔ اس کی تصویر آغا گل نے بھی پیش کی ہے کہ سرداروں کے حکم پر محکوم عوام کو سر تسلیم خم کرنے اور مزاحمت کے جواب میں ان کے عبرت ناک انجام اور جاگیرداروں کے سادہ لوح عوام کے معاشی، جذباتی اور جسمانی استحصال کی کہانی کو عمدگی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا گیا ہے۔[4]

بلوچستان میں سیاسی اقدامات اور ان کے رد عمل کے طور پر ابھرنے والی تحریک بلوچ موومنٹ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ سرحد میں سیاسی رہنما کے قتل کے بعد ملک میں پھیل جانے والی لاقانونیت اور احتجاج کی فضا میں سرکاری املاک کے نقصان اور آرمی کو نشانہ بنائے جانے کی کتھا آغا گل نے بے باک قلم سے بیان کیا ہے۔

ایوب خان کے طویل مارشل لا کے بعد عوامی احتجاج شروع ہوا تو 1967ء میں عوامی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو ابھر کر سامنے آئے جس نے عوام میں جمہوری نظام حکومت کی اہمیت اجاگر کی اور صوبائی خود مختاری کے علاوہ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا جو ملک کے چاروں صوبوں کے عوام کے لیے یکساں ہو گا لیکن بھٹو کے اقتدار میں آتے ہیں پیپلز پارٹی کی حکومت نے بلوچستان سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ عوام نے وزیر اعظم کے اس منشور پر احتجاج اور طنز کرتے ہوئے بیان کیا:

> "مگر صرف بلوچستان سے وعدہ پورا کیا ہے
> عوام کو دے رہا ہے
> جس کی روٹی مفت، پہننے کو جیل کی وردی مفت اور
> مکان کے طور پر قبر کی جگہ مفت

---

[3] آغا گل، **دشت وفا** (لاہور: کلاسک ناشر، 2010ء)، 20۔

[4] **ایضاً**، 23۔

جس پر ٹیکس بھی نہیں لگتا
نہ میونسپلٹی کا، نہ ہی ایکسائز کا"[5]

مزاحمت کا منفی کردار، عوام کی سہولت کے لیے بنائے جانے والی عمارتوں کو بم سے اڑا دینے کے مزاحمتی اراکین کے عمل کو بیان کیا۔ علاوہ ازیں انہیں کرداروں کی زبانی بلوچستان کے منظر کی عکاسی بھی کی اور لاہور کو پرامن شہر قرار دیدیا کیونکہ بلوچستان کی طرح پنجاب عالمی سیاست کی زد میں نہیں ہے:

"واپڈا ہاؤس کو بم سے اڑانے کا منصوبہ بنا تو رحمان نے اسے لاہور جانے کی پیشکش کی بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔ اشد ضروری تم میرے ساتھ چلو میں ان دنوں مفلوک الحال ہوں،۔۔۔۔۔۔ یہاں نہ تو تلاشیاں تھیں، نہ زنجیریں، پبلک پوائنٹ، بم کے دھماکے، اندھی گولیاں، انسان کے ٹکڑے۔۔۔ یہاں پرامن تھا شاید اس لیے لاہور میں کوئی نواب نہ ہی کوئی سردار۔۔۔۔ یہاں محض انسان تھے اپنی آزاد سوچ والے انسان ہی انسان جن سے کبھی کوئی سردار رشوت وصول نہ کر سکا۔ لاہور عالمی سیاست کی زد میں بھی نہ تھا"[6]

آغا گل نے "نجیب" کے کردار کے ذریعے بلوچستان کے عوام کا ملک کے جمہوری نظام کے متعلق نقطہ بھی پیش کیا ہے۔ ناول میں نجیب بلوچستان کے نوجوانوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔ 1971ء کی جنگ کے بعد ملک کے جمہوری نظام کی پٹری احسن طریقے سے چلنے کے حامی ہیں۔ وہ علامتی انداز میں اپنی ہی عوام پر بم پھینکے جانے کے خلاف سراپا احتجاج نظر آرہے ہیں مزاحمت کا مثبت رویہ سادہ الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔[7]

ناول نگار نے مفاد پرست اور نام نہاد سرداروں کی جاہلیت کے خلاف بھی مزاحمتی انداز اختیار کیا ہے کہ بلوچستان کے نوجوان جن کا مستقبل روشن تھا لیکن جو اپنے ہی لوگوں کے لیے بندوق اٹھائے لڑ رہے ہیں خون دے کر بلوچستان کی مٹی سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ لے رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے خاندان کے لیے بلکہ تمام بلوچستان کے عوام کی آزادی کے لیے مزاحمت کے اس نکتہ نظر سے راقم اندازہ لگا سکتا ہے کہ ناول نگار کے نزدیک بھی بلوچی نوجوانوں کے ہاتھ بندوق تھمانے میں سرداروں اور وہاں کے نوابوں کا بڑا ہاتھ ہے:

"یہ سب اچھے گھروں سے تعلق رکھتے تھے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے اب ان ویران بے آباد پہاڑوں میں لڑ رہے تھے۔ اپنے ہی لوگوں سے۔ اپنی ہی طاقت تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اپنا ہی خون بہا رہے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ بنیادی انسانی حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے۔ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ تمام بلوچستانیوں کے لیے"[8]

---

[5] ایضاً، 38۔
[6] ایضاً، 108۔
[7] ایضاً، 162۔
[8] ایضاً، 147۔

بلوچستان کی سیاست پر آغا گل کا دوسرا ناول "بیلہ "(2002ء) میں شایع ہوا۔ ناول کی کہانی "رحمان ڈرائیور" کے گرد گھومتی ہے، جس کا باپ اور چچا پہاڑوں میں آزادی و حقوق کی جنگ لڑتے شہید ہوگئے۔ رحمان بھی اپنے باپ چچا کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ مصنف نے اس کردار کے ذریعے بلوچی نوجوانوں کے نظریات کو تحریک دی ہے۔ علاوہ ازیں بلوچستان کے مسائل کی بھی نشاندہی کی ہے کہ کیسے سرداروں کے استحصالی گروہوں کے ظلم و ستم، سرکاری اہلکاروں (فوجی) کی ناانصافیوں سے بلوچستان کے سیاسی حالات خراب ہوئے ہیں۔ سیاسی نظام کی نااہلی کے سبب وہاں کے مقامی افراد کو جب ذلت کو برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ناول میں ان کی تصویر کشی کی ہے۔ "بیلہ" میں مشرف کے مارشل لا کے عہد میں بلوچستانی عوام کے دلوں میں فوج سے نفرت کا اظہار دیکھا ہے مزاحمتی حوالے سے مطلق العنان حکمران کے خلاف نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

> "شمروز تو چاہتا تھا کہ رحمان کو اسکول میں تعلیم دلائی جائے مگر دادی کو اول تو یہ اعتراض تھا کہ وہ امداد کیوں لے۔ دوسرا یہ کہ تعلیم حاصل کر کے بھی اسے لاٹھی گولی کی سرکار کی ملازمت اختیار کرنا ہوگی۔ کسی آمر کے لیے اپنے ہی لوگوں پہ ظلم و ستم روا رکھنا ہوگا۔ ظلم کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔ کافروں کی حکومت تو رہ سکتی ہے بے انصاف اور ظالم حکومت کا انجام جہنم ہے۔ ایسی افسری سے محنت مزدوری ہی بہتر ہے"[9]

بلوچستان میں انسانی حقوق کے لیے جو تحریک چلی، جس سے نوجوانوں کو کتاب کے بجائے بندوق پکڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اس تحریک کے روح رواں مرکزی کردار "رحمان" کے والد اور چچا شامل تھے، جو جھڑپوں میں قربان ہوگئے۔ ان کے قربان ہونے کو مصنف آزادی تحریک گردانتے ہیں اور بلوچستان کے عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے مصنف کا فوج کے خلاف مزاحمتی رویہ صفحۂ قرطاس پر اتارا گیا۔[10]

بلوچ عوام کے حقوق کے لیے رحمان کے والد اور چچا کی قربانی کو ناول نگار ناول میں کئی جگہ بیان کرتا ہے، جو اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ مصنف کے نزدیک جہاں بلوچ نوجوانوں کو سرداروں نے مزاحمت پر اکسایا وہاں اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں فوجی حکومت کی بلوچ عوام سے نفرت کو مزید ہوا دی۔

بلوچ سماج میں عورت کو اتنی عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے شاید ہی کسی اور معاشرے میں ایسا ہو۔ اگر دو فریقوں یا دو قبائل کے درمیان لڑائی یا جنگ و جدل تک نوبت پہنچ جائے تو کوئی خاتون لڑائی یا جنگ ختم کروانے آجائے تو عورت کی عزت و احترام کی خاطر ختم کر دیتے ہیں مصنف نے کوئٹہ سے کراچی جانے والی سڑک پر رحمان کی بس میں آدھی رات کو فوجیوں اور دیگر صوبوں کی پولیس کا مزاحمتی رویہ منفرد الفاظ میں بیان کیا ہے:

---

[9] آغا گل، **بیلہ** (کوئٹہ: قلات پبلی کیشنز، 2008ء)، 23۔

[10] **ایضاً**، 19-20۔

"یوں کہ رات کے ڈھائی تین بجے کوچ جب سمندری حدود میں دوڑا جارہا تھا تو حسب معمول کوسٹ گارڈ کا چیک پوائنٹ آیا۔ جہاں سارے مسافروں کو اتار دیا جاتا۔ زن و مرد کی بھی تخصیص نہ تھی۔ بلوچستان میں خواتین کا خاص احترام ہے ۔ کوئی بلوچستانی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کسی خاتون کو رات کے دو بجے جگایا جائے اور اس کی تلاشی لی جائے۔ اس سے بات کی جائے۔ یہاں تک کہ باپ یا بھائی بھی رات کے وقت بہنوں بیٹیوں کے کمروں میں نہیں جاتے، کجا یہ کہ ان کی خواتین کو جگا کر رات کے دو بجے کوچ سے نکال باہر کیا جائے ۔ بارہا جھگڑے ہوا کرتے ۔ رحمان لاتعلقی سے دیکھتا رہتا۔ سٹارٹ بس چھوڑ کر، ہینڈ بریک کھینچ کر وہ خود بھی باہر آجایا کرتا، اسے بحث و مباحثہ دلچسپ سا لگتا"[11]

جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو امریکہ کو پاکستان کی یاد آئی اور ضیاء کے دور میں پاکستان سے مذہبی بنیادوں پر لوگ مجاہدین بنا کر جہاد کے نام پر امریکہ کی جنگ میں بھیجے گئے لیکن نائن الیون کے بعد وہی مجاہدین دہشتگرد کہلانے لگے تو امریکہ نے مسلمانوں سے متعلق پالیسیاں سخت کر دی جن کی وساطت سے مغرب میں مسلمانوں کو خطرناک قرار دیا جاتا ہے امریکن پالیسی کے خلاف مزاحمتی رنگ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"امریکہ شریف نے باریش مسلمانوں کو خطرناک قرار دیا تھا لہٰذا ان کی تو خوب تلاشی ہوتی۔ ان کے شناختی کارڈ بھی طلب کیے جاتے ذرا سی بات پہ انہیں دھر لیا جاتا"[12]

پاکستانی ایجنسیوں کے ناروا سلوک کے خلاف بلوچ عوام کے رد عمل کی عکاسی بھی آغا گل نے کی ہے کہ کس طرح رات کے وقت بلوچ مسافروں کے ساتھ بسوں سے اتار کر تلاشی لی جاتی ہے:

"رحمان پہ آبائی غصہ طاری ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دوڑ کر ٹول بکس کھولا اور وہیل رینچ نکال لیا۔ قریب تھا کہ وہ ان کے چیتھڑے اتار دیتا۔ بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر سٹاف بھاگ کھڑا ہوا، دیگر کوچز کے ڈرائیور بھی اتر آئے، مسافر تو پہلے ہی بدتمیز سٹاف کے خلاف تھے۔ جلے بھنے بیٹھے تھے وہ بھی لڑنے کو پر تولنے لگے۔ چند اچکزئی بھی مسافروں میں شامل تھے۔ اچکزئیوں کا کسٹم سے زنجیر والوں سے لڑنے بھڑنے کا پرانا تجربہ ہے، انہوں نے مشورہ دیا کہ سٹاف پہ پتھراؤ کیا جائے۔ بلوچستان میں سنگسار کے لیے پتھروں کی کیا کمی ہے۔ مسافر MOB میں تبدیل ہو چکے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی پتھر اٹھا لیے۔ اچکزئیوں نے کندھوں سے پٹو اتار لیے اور پتھروں کا ذخیرہ جمع کرنے لگے۔ کوئٹہ سے بدستور کوچ چلے آرہے تھے، بلوائی بڑھتے جارہے تھے"[13]

---

[11] ایضاً، 58-59۔

[12] ایضاً، 60۔

[13] ایضاً، 61۔

بلوچستان کے عوام فوج اور ایجنسیوں کے ناروا سلوک سے زندگی کی بازی بھی ہارنے کو تیار ہو گئے۔ آغا گل ان کی بھی یہاں نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں کہ فوجی وردی میں علاقائی تعصب کی بنیاد پر پرامن ہموطنوں کو آنکھیں دکھاتے ہیں اور بلوچستان کے معاملے میں مکالمے کے بجائے گولی چلتی ہے۔ ہماری آرمی اور دیگر خفیہ ایجنسیوں کے خلاف مزاحمتی رنگ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "رحمان لال بھبھو کا بنا وہیل رینچ تھامے حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ چیکنگ سٹاف درجن بھر سے زیادہ نہ تھا وہ اپنی بیرک میں جا چھپا تھا سٹاف کو جان کے لالے پڑے تھے وردی پہن کر اپنے پرامن ہم وطنوں کو آنکھیں دکھانا اور بات ہے، بپھرے ہوئے ہجوم کا سامنا کرنا اور بات ہے۔ یہاں تو بات ہوتی ہی نہیں، لڑائی ہوتی ہے۔ اور لڑائی میں تو علم نہیں ہوتا کون کب مارا جائے گا۔ زندگی کے ستائے ہوئے لوگ مرنے کے لیے تیار ہی ہو چکے تھے"[14]

ناول کا مرکزی کردار "رحمان" پورے بلوچی عوام کی نمائندگی کر رہا ہے مصنف نے یہ کردار بھی مزاحمتی تخلیق کیا ہے، جو کہ محافظوں کے خلاف مزاحمتی رنگ کو دردناک الفاظ میں بیان کرتا ہے ناول میں ہمارے ملک کے محافظ کا بلوچستان سے نفرت کا اظہار ملتا ہے[15]

ناول نگار نے وطن فروش اشرافیہ کے خلاف وطن دشمن درندوں کی منفی سوچ کے خلاف مثبت مزاحمت کی عکاسی بھی کی ہے اس میں مزاحمت کا رنگ منفرد ہے کہ بلوچ عوام نے اپنے حالات بہتر کرنے ہیں تو لاہور اور اسلام آباد میں سکونت اختیار کر لو یا فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ یہاں مصنف کا نقطۂ نظر طنزیہ ہے کہ بلوچ خود بھی بلوچستان کے حالات میں بہتری لا سکتے ہیں جبکہ دیگر صوبوں کے عوام یا فوج حالات بہتر کرنے کا سارا کریڈٹ خود لینا چاہتے ہیں:

> "وسیع تر مفاد میں سوچنا سیکھو۔ اگر اقتدار میں آنا ہے تو صاحب اقتدار لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔ لاہور اور اسلام آباد جا بسو۔ فوج میں شامل ہو جاؤ۔ ناراض ہو کر پہاڑوں میں چلے جانے سے کیا ہو گا؟ جیسے بلوچستان کے افسروں نے بطورِ احتجاج سرکاری ملازمت سے استعفے دے دیئے تھے۔ عطاء اللہ ولہاری اکبر خان کاکڑ، عبداللہ جان جمالدینی، کمال خان شیدانی اور بیسیوں دوسرے تعلیم یافتہ نوجوان جو اس علاقے کی تقدیر بدل سکتے تھے۔ انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی اس نظام سے حالانکہ وہ اس نظام میں شامل رہ کر ہی اسے بدل سکتے تھے"[16]

آغا گل نے استعماری طاقتوں کے خلاف بھی مزاحمتی انداز اپنایا ہے کہ جس کا زہر بلوچستان کے سرداروں اور نوابوں میں سرایت کر گیا ہے اس میں زہر کے اثرات آج بھی موجود ہیں جس کے سبب بلوچ عوام لسانی، علاقائی، تہذیبی تعصب کی بنیاد پر ایک دوسرے کو مارتے ہوئے مر جائیں گے۔[17]

---

[14] **ایضاً**،62۔

[15] **ایضاً**،64۔

[16] **ایضاً**،69۔

[17] **ایضاً**،80-81۔

استعماری نظام کے خلاف مزاحمت کا ایک اور انداز ان الفاظ میں بیان کیا کہ بے شک ہم موجودہ عہد میں بھی استعماری قوتوں کے زیر اثر ہیں کیونکہ ہم جس سماج میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں مقامی زبانوں کو ہم نے ترک کر دیا ہے، 70 سال آزاد ہوئے بھی انگریز حاکموں کی انگریزی زبان کی ترویج کرتے ہیں اور اسی میں اپنی بقا سمجھتے ہیں اور ہمارے ذہنوں سے انگریزی کا بخار نہیں اتر سکتا۔ یہاں راقم یہ سمجھتا ہے کہ بلوچستان کا امن خراب کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ انگریزوں کا تھا لیکن بلوچ عوام اپنی مقامی زبان کو ترک کر کے انہیں انگریزوں کو ترقی دیتے ہیں کیونکہ انگریزی زبان کے بغیر حاکموں میں شامل نہیں ہو سکتے:

> "ہاں! مگر مسلمان ایک طاقت بن رہے تھے، طاقت اپنے مقابل میں طاقت برداشت نہیں کر سکتی۔ ہاتھی اور شیر میں کیا دشمنی ہے؟ ہاتھی سبزی کھاتا ہے اور شیر گوشت، پھر لڑائی کس بات کی۔ امریکی ڈالر سے لڑی جانے والی جنگ اسلامی جہاد کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟"
>
> کسی دل جلے نے سوال کیا "سکول کا نام Tower of London کیوں رکھا ہے؟"
>
> "برطانیہ کے دانشوروں، آزادی پسندوں کو حکمران لندن کے Tower میں قید رکھتے۔ جیسے راجر بیکن کو میر غوث بخش بزنجو کی طرح پچیس برس قید رکھا۔ ہمارا Tower ایک ایسا محل ہو گا جو آزادی، شعور اور علم کی بات کرے گا۔ قید کی بات نہیں کرے گا۔ آزادی کی بات کرے گا۔ یوں بھی لوگ انگریزی ناموں پہ گرتے ہیں۔ حاکم کبھی محکوموں کی زبان نہیں بولتے۔ حاکم ہماری زبانوں کو بھی مقامی زبانیں کہہ کر ایک طرف پھینک چکے حالانکہ یہ قومی زبانیں ہیں۔ مقامی زبانیں کہاں ہیں؟، انگریزی میں ہی ہماری بھی بقا ہے۔ اسی کے ذریعے ہم حاکموں میں شامل ہو سکتے ہیں"[18]

آغا گل نے امریکی پالیسیوں کے خلاف مزاحمت منفرد انداز میں بیان کی ہے کہ انگریزوں کے پاس بے بہا دولت ہے۔ وہ ضروریات زندگی کی ہر چیز پر ٹیکس لگا کر ہم سے ہی دولت کماتے ہیں جبکہ ہمارے بچے بھوک اور افلاس کا شکار ہیں۔ گیراجوں میں کام کرتے ہیں وہ ہمیں کبھی کمزور سمجھ کر عراق پر حملہ کر دیتے ہیں تو کبھی افغانستان پر۔ انگریز ہیروئن کے عادی ہیں اور دنیا میں اسی فیصد افراد کو ہیروئن کی چاٹ لگی ہوئی ہے کیوں نہ ہم انھیں ہیروئن پلا پلا کر مار دیں، آغا گل اس کو جہاد گردانتے ہیں۔[19]

بلوچستان کے دوسرے بڑے ناول نگار فارس مغل ہیں جن کے دو ناول بالترتیب "ہم جان" اور "سو سال وفا" منظر عام پر آ چکے ہیں "ہم جان" میں مزاحمتی پہلوؤں کا جائزہ آئندہ ابواب میں ہو گا جبکہ "سو سال وفا" (2018ء) بلوچستان کے پس منظر میں لکھا گیا سیاسی ناول ہے لیکن ناول میں رومانوی فضا حاوی نظر آتی ہے۔ ناول نگار نے بلوچستان میں اکبر بگٹی کی شہادت کے بعد کی صورتحال کو واضح کیا ہے اور یہاں کے باسیوں کے مسائل کی تصویر کشی عمدگی سے کی ہے۔ وہ باتیں جو کہ ہمیں پاکستان سے قبل بلوچستان ہجرت کر کے آئے تھے اور ان کی موجودہ نسل میں پنجاب سے نفرت سرعت سے ان کی نیچر میں داخل ہو چکی ہے۔ ناول کے بیانیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار

---

[18] ایضاً، 93۔

[19] ایضاً، 106۔

پاکستانی سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کے نزدیک بلوچستان کے مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ فارس اپنے دونوں ناولوں میں بلوچستان کے مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ان کے حل کرنے کے جتن کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ناول میں مزاحمتی رنگ بھی نمایاں ہے فارس نے ناول میں پنجابیوں اور ہزارہ شیعہ کی ٹارگٹ کلنگ خصوصاً وومن یونیورسٹی کی بس میں خودکش دھماکے کے بعد 14 طالبات کے جل کر مر جانے پر داستان کے اخبار میں کالم لکھنے پر اخبار کے مالک ہدایت کو دھمکی آمیز ٹیلی فون آتے ہیں تو ہدایت کا کسی دھمکی کو خاطر میں نہ لا کر بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے داستان کا ساتھ دینے کی جو کتھا سنائی ہے اس میں بلوچستان کو تباہ برباد کرنے میں اپنوں کے سیاہ چہروں سے نقاب کشائی کرتا ہے، جو چند روپوں کی خاطر اپنی ہی دھرتی ماں کو غیروں کے لیے جہنم بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ناول میں انفرادی اور اجتماعی مزاحمت کا بھرپور عکس دکھائی دیتا ہے۔

بلوچستان سے تعلق رکھنے والے فارس مغل نے سچائی اور دیانت داری کے ساتھ بلوچی عوام کے کرب کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ انہوں نے بلوچیوں کے ذہنوں میں پلنے والی مزاحمت کا عکس ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "یوسف کا شمار بلاشبہ اول الذکر لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جبکہ داستان مؤخر الذکر ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک تھا جو حکومت کی بلوچستان پر مبنی پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتا۔ ظلم کو ظلم کہتا۔ ظالم کو ظالم لکھتا۔ ظالم اور ظلم کی کوئی بھی صورت، رنگ نسل زبان ہوتی وہ مظلوم کیساتھ کھڑا دکھائی دیتا"[20]

ناول کے مرکزی کردار اور محبت کے استعارہ "داستان" کی مزاحمتی فکر کو فارس نے ناول کے بیانیے میں اس طرح پیوست کیا ہے کہ داستان کا مزاحمتی رویہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایسا کالم نگار جو حکومتی پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتا ہے اور ظلم کے خلاف اس کا قلم نشتر کی طرح چلتا ہے۔[21]

کالج اور یونیورسٹی دور میں داستان کی باغیانہ سوچ اور فکر کی ترویج کے لیے کالج اور یونیورسٹیوں کے تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا مقصد استحصالی قوتوں کے مظالم کے خلاف بھرپور احتجاج اور اسی طرح سے سیاسی جماعت کی طلبہ تنظیم کا ممبر ہونے اور پارٹی کو صوبائی مرکز تک پہنچنے کے مراحل کی تصویر کشی فارس نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "اب وہ ایک بدلا ہوا شخص تھا۔ اس کی گفتگو میں علمیت کا رعب ہوتا ہم جماعتوں کے لیے اس کی شخصیت پر کشش بن چکی تھی۔ وہ اس کشمکش میں رہتے کہ آیا اس کی ظاہری وجاہت سے متاثر ہیں یا اس کی علمیت کے زیر اثر ہیں۔ ایک دن اس نے

---

[20] فارس مغل، **سو سال وفا** (کوئٹہ: ہمجان پبلی کیشنز، 2018ء)، 48۔

[21] **ایضاً**۔

کالج کا ڈیبیٹ کلب جوائن کر لیا وراس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اندر گھٹن بڑھنے لگی تھی اس کا مقصد مقابلہ جیتنا نہیں بلکہ تقریر کے ذریعے استحصالی قوتوں کے خلاف اپنی بھڑاس باہر نکالنا تھا"[22]

داستان کے کردار میں بچپن سے ہی مزاحمتی کردار کی وضاحت عمدگی سے کی ہے بچپن ہی سے زیادتی اور ظلم برداشت نہ کرنے اور بھرپور مزاحمت کرنے کی کہانی اس اقتباس سے واضح ہو جاتی ہے جس میں داستان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف احتجاج کو خود بتا رہا ہے:

"اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی زیادتی کی صورت میں اپنا احتجاج بھرپور طریقے سے ریکارڈ کرواتا اور بعد میں جوتے بھی کھاتا۔ اس کی زبان سے نکال ہوا، 'نہیں' کبھی بھی 'ہاں' میں نہ بدلتا۔ اسکے 'نہیں' نے خاندان بھر میں کھلبلی مچا رکھی تھی"[23]

نائن الیون کے بعد بلوچستان کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہوا لیکن اکبر بگٹی کے قتل نے بلوچوں کے دلوں میں پنجابیوں کے خلاف بجھنے والی آگ پر تیل کا کام کیا۔ قتل کے نتیجے میں ہنگامہ اور عوامی مزاحمت جو کہ سراسر منفی تھی اسکا فائدہ پاکستان مخالف شر پسندوں کو ہوا جنہوں نے اس سال میں متعدد دکانیں لوٹ لیں ہر طرف گولیوں کی گرج سنائی دینے لگی یہاں مزاحمت میں مکمل نقصان پاکستان کا ہوا جس کو بے باک ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اس رات کوئٹہ شہر میں غم، غصے اور خوف کا ایسا عالم تھا کہ کوئی شاہراہ، گلی، بازار، علاقہ ایسا نہیں بچا جہاں سے راکھ اور دھواں اڑتا ہوا نظر نہ آتا ہو۔ مشتعل گروہوں کے آگے باندھنا پولیس کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ سرکاری عمارتوں، گاڑیوں، بسوں، درسگاہوں، ہسپتالوں سے آگ کے شعلے برآمد ہوتے۔ بہت سے شر پسندوں، لٹیروں نے اس آڑ میں سرِ عام دکانیں لوٹ کر خالی کر دیں۔ سرکاری اور نجی املاک پر راکھ مل دی گئی۔ گولیوں کی گھن گرج دل دہلا دیتی۔ شہر میں ایسی بُو در آئی جس میں غم اور غصے سے زیادہ نفرت کے فیوم محسوس ہوتے اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ آنے والے وقتوں میں کب تک یہ بدبو شہر کی فضاؤں میں گھلی رہے گی"[24]

خوف اور دہشت کے موسم میں بلوچستان میں ایسے نوجوانوں کی تعداد کافی تھی جو کہ قومی یکجہتی کی بات کرتے تھے اس کی مثال نوجوان کردار "داستان" ہے، جو کہ صوبائی اور قومی یکجہتی کی بات کرنے والے داستان کے جذبہ حب الوطنی کی تصویر کشی کرتے ہوئے فارس نے دونوں گروپوں کے افراد کو بگڑ جانے اور مسلح دستی مزاحمت شروع ہونے کے نتیجے میں داستان کے شدید زخمی ہونے کی کہانی کو دردمندانہ انداز میں بیان کیا۔

---

[22] ایضاً، 23۔

[23] ایضاً، 31۔

[24] ایضاً، 95۔

کسی بھی معاشرے کا سب سے زیادہ باعزت فرد استاد ہوتا ہے ناول میں موجود استاد کا کردار "راجہ منصور" اپنے وقار اور اپنی عزت نفس کے تحفظ کی خاطر پرنسپل اور سیکرٹری تعلیم کو خاطر میں نہ لانے کا انداز منفرد ہے کہ افسران بالا کو کہنا کہ میں عوامی ملازم ہو اور عوام کے ٹیکس سے تنخواہ وصول کرتا ہوں۔[25]

مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو بلوچستان میں لکھے جانے والے ناولوں میں وہاں کی ثقافت، لسانی، تہذیبی مسائل کی عکاسی ملتی ہے علاوہ ازیں 1970ء کی دہائی کے بعد بلوچستان کے ساتھ ہونے والی محرومیوں اور ہماری فوج اور دیگر ریاستی اداروں کے ناروا سلوک کے خلاف مزاحمت مختلف انداز میں نظر آتی ہے اور یہاں کے قبائل اور سرداروں کی مفاد پرستی کے سبب بحیثیت قوم جو نقصان اٹھایا ان نقصانات پر بھی فکشن نگاروں کا برملا اظہار ملتا ہے۔

☆☆☆

[25] ایضاً، 66۔